Oriental College Magazine, Vol.102, No. 01, Serial No. 383, 2026

انتظار حسین کا کٹا ہوا ڈبا

محمد نعیم، پی ایچ ڈی

ایسوسی ایٹ پروفیسر اُردو

ادارہ زبان و ادبیات اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

The Detached Compartment of Intizar Hussain

Muhammad Naeem, PhD
Associate Professor of Urdu
IULL, University of the Punjab, Lahore

Abstract

What is the significance of Intizar Husain in Urdu fiction? One methodological approach to addressing this question is to demonstrate through a structural analysis of his narratives the role they play in imparting depth to discourse, style, and more broadly, to the overarching literary tradition. In our view, one of Intizar Husain's major contributions lies in his liberation of Urdu fiction from the constraints of colonial temporality, which prior to his intervention was unconsciously embedded within the robust tradition of Urdu short fiction. This examination is crucial because before Intizar Husain, at least within the domain of Urdu fiction, the capacity to perceive temporal frameworks beyond the contemporary moment was lacking. In this article, through the analysis of one of Intizar Husain's narratives, I will show how his fiction, by synthesizing multiple epistemologies, fundamentally reconceptualizes the understanding of human subjectivity beyond any singular or monolithic interpretive and temporal framework.

Keywords:
Colonial Temporality, Worldview, Epistemology, Urdu Short Fiction

اردو افسانے میں انتظار حسین کی اہمیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے تشکیلی تجزیے سے دکھایا جائے کہ وہ بیان، اسلوب، اور پھر اس سے بڑھ کر مجموعی ادبی روایت کو گہرائی عطا کرنے میں کیا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں انتظار حسین کا ایک بڑا کارنامہ اس نو آبادیاتی وقت (colonial temporality) کی جکڑ بندی سے اردو افسانے کو آزاد کروانا ہے، جو اُن سے پہلے غیر محسوس انداز میں اردو افسانے کی طاقت ور روایت میں گندھا ہوا تھا۔ یہ دیکھنا اس لیے ضروری ہے کہ انتظار حسین سے پہلے، کم از کم اردو افسانے میں، عصرِ رواں کے سوا اور زمانوں کا گزر کم ہی ہوا ہے۔ اس مضمون میں ہم ان کے ایک افسانے کے تجزیے سے دکھائیں گے کہ کیسے ان کا فکشن مختلف علمیاتی صورتوں (epistemologies) کو مجتمع کر کے کسی ایک یا واحد انداز سے انسانوں کی تفہیم کے تصور کو یکسر بدل دیتا ہے۔ ہمارا منہاج (method) یہ ہے کہ پہلے اردو افسانے کی تاریخی روایت میں غالب علمیاتی رجحان کی نشاندہی کی جائے، اور پھر انتظار حسین کے ایک نمائندہ افسانے کی تفصیلی تشکیلی قرأت سے یہ ظاہر کیا جائے کہ ان کے ہاں بیانیہ تکنیک، علامتی نظام، اور کرداروں کے باہمی مکالمے کس طرح متوازی تصوراتِ کائنات (worldviews) کو یکجا کرتے ہیں۔ یہ تجزیہ بنیادی طور پر متن مرکوز (text-centered) ہے، لیکن اسے نو آبادیاتی وقت (colonial temporality) اور علمیات (epistemology) کے نظری تصورات کی مدد سے مربوط بنایا گیا ہے تاکہ ادبی تکنیک اور تہذیبی شعور کے درمیان رشتے کو سمجھنا آسان ہو سکے۔ ہماری مرکزی دلیل یہ ہے کہ انتظار حسین نے فکشن میں محض یادداشت، ماضی اور ناسٹیلجیا سے کام نہیں لیا، ان کا بیانیہ اس سے بڑھ کر ایک تہذیبی علمیات کا کام کرتا ہے جو نامختتم، لاینحل، مکالماتی (dialogic) اور زبانی روایتوں کے ذریعے قائم ہونے والے تصورِ وقت کی مدد سے نو آبادیاتی وقت کو بے دخل کرتا ہے۔

نو آبادیاتی وقت کے بارے میں جاننا چاہیے کہ یہ ایک ایسی استعماری کوشش تھی، جس کے نتیجے میں انسانی تاریخ کو ایک لکیری اور ارتقائی وقت کے طور پر تصور کیا گیا، جس کی مختلف ترقیاتی مراحل (developmental stages) میں تقسیم کی گئی۔(۱) اس ارتقائی وقت میں مغرب کو سب سے ترقی یافتہ قرار دیا گیا اور اس کی مختلف ارتقائی منازل کو معیار بناتے ہوئے مختلف نو آبادیوں کو مغرب کے ماضی کے مختلف مراحل میں سے کسی ایک دور میں پسماندہ یا منجمد دکھایا گیا۔(۲) والٹر مگنولو (Walter Mignolo) نے دکھایا ہے کہ کیسے استعماری قوتوں نے یورپی زمانیت کو وقت کا واحد پیمانہ قرار دیا۔ مزید برآں علم اور طاقت کی استعماریت (coloniality) سے دیگر سماجوں کے تصورِ زمان (temporalities) کو علمی دنیا سے

بے دخل کرنے کی کوشش کی گئی۔(۳) ایسی کوششوں کا ایک جواب ادبی دنیا میں بیک وقت کئی زمانوں کی موجودگی سے دیا جا سکتا ہے۔ ادب حقیقت کی پیچیدہ تصویروں کو مرکز میں لا کر وقت کی مختلف صورتوں کو دریافت کرنے کا ایک ذریعہ بنتا ہے۔ اس لیے فکشن کی مدد سے دیکھنا دلچسپ ہو سکتا ہے کہ اردو افسانہ کس طرح مابعد استعماری پاکستان میں یاد داشت، صوفیانہ ملفوظات، اور مابعد الطبیعاتی مظاہر کے ذریعے لکیری زمان کے تصور کو چنوتی دے رہا تھا۔

انتظار حسین سے قبل اردو میں افسانے کی توانا روایت قائم ہو چکی تھی، جس میں انسان کے انفرادی اور اجتماعی پہلو بیانیے کا حصہ بن رہے تھے۔ خارجی حقائق کو سماجی اقدار سے منسلک کرتی افسانوی کاوشیں بیسویں صدی کے نصف اول تک مضبوط رجحان کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ انسان کے جذباتی پہلو، سماجی رشتے، اور معاشی مسائل پر لکھتے ہوئے افسانہ نگاروں نے نفسیاتی، سماجی اور ترقی پسندانہ حقیقت نگاری کے مختلف طور اردو افسانے کی دنیا میں رائج کیے۔ پھر بڑے اجتماعی مسائل بھی افسانہ نگار کی نظرِ التفات میں آئے اور محبت جیسے لطیف جذبے کی بعض بہت باریک پرتوں کو انفرادی سطح پر دیکھ لیا گیا تھا۔ ایسے متنوع موضوعات کے لیے زیادہ تر افسانہ نگاروں کے ہاں راست بیانیے تخلیق کیے گئے، جس کی بنیاد تصورِ کائنات اور تصورِ وقت کی وحدانیت پر تھی۔ اس افسانوی روایت کی بنیاد میں وقت کو ایک بہتے ہوئے دریا کی مانند تصور کیا گیا، جس میں ایک کے بعد دوسرا واقعہ پیش آئے، اور دوسرا واقعہ پہلے کا نتیجہ ہو، یعنی serial time پلاٹ کے منطقی تصور کو جلو میں لیے آ رہا تھا، جس نے کرداروں کی زندگی کو ایک تسلسل میں بیان کرنے کو رواج دیا، جس میں کردار کے افعال سے نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ یہ طور، وقت کے اس تصور سے منسلک ہے، جس سے اردو دنیا نو آبادیاتی زمانے میں متعارف ہوئی۔ اس روایت کے افسانہ نگاروں کے ہاں نقطہ ہائے نظر کا تنوع تو موجود تھا، لیکن ایک بات پر شاید سب کو یقین تھا کہ انسان کے بارے میں حواس کے ذریعے جانا جا سکتا ہے اور ان معلومات کی تفہیم عقلِ عامہ (common sense) کی مدد سے کی جا سکتی ہے۔ انسان مسلسل زمانے کے چاک پر بنتا بگڑتا ہے۔ یوں کرداروں کے درمیان کسی نکتے پر اختلاف تو موجود ہوتا تھا اور افسانہ نگار اسے پلاٹ کی بنت کے لیے استعمال بھی کرتا تھا، لیکن یہ اختلاف زیادہ تر خواہش، نقطہ نظر، یا تناظر کا اختلاف تھا، تصورِ کائنات اور زمانے کا نہیں۔ سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند بظاہر یکسر مختلف افسانہ نگار دکھائی دیتے ہیں، تاہم ان کا امتیاز موضوعی ہے، علمیاتی نہیں۔ دونوں انسان کو سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اور دونوں اس کے سماجی دائرے کو وسیع کرنے کا جتن کرتے ہیں، ایک کے لیے انفرادی / نفسیاتی پہلو زیادہ اہم ہے جبکہ

دوسرے کے لیے سماجی حیثیت اور معاشی مقام کی اہمیت دوچند ہے۔ لیکن علمیاتی سطح پر دونوں کے ہاں تجربی اور مسلسل وقت کا پہلو غالب ہے۔ ایک اور فرق دونوں کے سماجی پس منظر کا بھی ہے۔ البتہ دونوں فرد کا مشاہدہ عام انسانی آنکھ سے کرتے ہیں، اور دلِ دردمند سے اس مشاہدے کو افسانے میں سمو دیتے ہیں۔

اس علمیاتی وحدانیت سے پنپنے والے راست بیانیے (Linear narrative) کی افسانوی روایت میں سبھی کرداروں کا تصورِ کائنات اور تصورِ وقت یکساں ہوتا ہے۔ اسلوب اور موضوع کی سطح پر افسانہ نگاروں میں فرق تجربی حقائق کے تنوع سے پیدا ہوتا ہے۔ کسی کو محبت کرنے پر موجود بندشیں زیادہ دکھائی دیتی ہیں(۴)اور کوئی محدود معاشی وسائل سے جوجھتے انسان کے سماجی مسائل کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔(۵) منٹو نے حکومت اور فرد کے نئے رشتوں، فرد کی متنوع شخصیتوں، اور شخصیت میں موجود تضادات کو اردو افسانے میں حقیقت پسندی سے بیان کیا(۶)تو انسانی رشتوں کی نزاکتوں کا فنکارانہ بیان راجندر سنگھ بیدی کے حصے میں آیا۔(۷)ان سبھی افسانہ نگاروں نے اردو میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بہترین مرقعے پیش کیے، جنھیں عموماً راست بیانیے کی تکنیک سے سامنے لایا گیا ہے۔ یہاں واضح کرتا چلوں تصورِ کائنات سے مراد یہ ہے کہ انسان، خود کو فطرت، سماج اور خدا کے بالمقابل کیسے دیکھتے ہیں۔(۸)جونز کے لفظوں میں کہیں تو تصورِ کائنات فرد کے اعتقادی نظام میں انتہائی اہم اور وسیع دائرہ اثر رکھنے والے رجحانات کا مجموعہ ہوتا ہے جو اس کے قول و عمل میں ظاہر ہوتے ہیں، لیکن جن کا شعور اکثر فرد کو نہیں ہوتا۔(۹) اگر غور کیا جائے تو اردو کے ابتدائی پچاس برس کے زیادہ تر افسانہ نگاروں کے ہاں ان کا اپنا تصورِ کائنات غالب ہے، جس میں حواس اور عقلِ عامہ کی کارفرمائی سب سے زیادہ ہے اور بیشتر افسانہ نگار انیسویں صدی میں سامنے آنے والے نوآبادیاتی وقت (Colonial Temporality) کے دائرے کے اندر انسانوں کی مختلف انفرادی واجتماعی کیفیات کو پیش کرتے رہے۔

دوسرا یہ پہلو بھی نظر میں رہنا چاہیے کہ زیادہ تر افسانہ نگار خود کو سماج پر اثر انداز ہونے والا ایک اہم فرد سمجھتے تھے۔ مصنف کے اس سماجی اصلاح پسند تصور کے پیچھے قریب ایک صدی کی وہ روایت کھڑی تھی، جسے زبانی روایت(oral tradition) کے حامل اردو سماج میں لکھے (written)اور چھپے ہوئے (published) لفظ کی اہمیت جتانے کے لیے متعارف کروایا گیا تھا اور ہندوستان کو ایک جاننے کے قابل شے میں بدل دیا گیا تھا۔(۱۰) استعماری عہد کے دوران میں مقامی آبادی کی تشکیلِ نو کے لیے تعلیمِ عامہ کے آغاز نے اس تصور کی تشکیل میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔(۱۱) جس کے بعد مصنف پہلی بار ایک ایسے شخص کے روپ میں سامنے آیا، جسے ناخواندہ عوام سے مخاطب ہونا تھا، ان کی تربیت کرنا تھی۔ یعنی ادب خود اس

سماج میں تبدیلی کے ایک آلے کے طور پر پہلی بار متصور ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف اول سے قبل، کسی اردو ادیب کے ہاں یہ تصور موجود نہیں کہ وہ شعر کے ذریعے سماج کو تبدیل کرے گا۔ انتظار حسین سے پہلے کے افسانہ نگاروں کے ہاں راست بیانیے کی ایک وجہ یہ شعور بھی ہے، اسی لیے ان کے افسانوں میں ہم زیادہ تر واقعات و نتائج کو افسانہ نگار کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

انتظار حسین کے افسانے عموماً راست بیانیے نہیں ہوتے۔ یہ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم وقت کے لکیری سفر پر پیدائش سے موت تک مستقیم چلتے چلے نہیں جاتے، کبھی ماضی، حال میں آن ملتا ہے، اور کبھی حال مستقبل سے جا لگتا ہے۔ انسان اپنے اہم ترین فیصلے مستقبل کی 'افسانوی توقعات' کے تحت کرتا ہے۔ یوں اس کا مستقبل، حال کو تبدیل کر دیتا ہے۔(۱۲) اس لیے اگر ہمیں انتظار حسین کے ہاں مختلف زمانوں کی لہروں کی آر جار لمحہ موجود کے تالاب میں دکھائی دیتی ہے تو اسے مافوق الفطری یا رجعت پسندی کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ انتظار حسین کے افسانوں میں علامتیں محض اسلوب کی خوش نمائی کے لیے نہیں آتیں، یہ ہمیں احساس دلاتی ہیں کہ اور زمانے بھی ہیں، جن کا نہیں کوئی نام۔ یوں یہ افسانے محض ہئیت کا تجربہ نہیں رہتے، حقیقت کی تہہ در تہہ پرتوں اور تصورِ وقت کے متنوع زاویوں کو بیان کرنے کا سلیقہ بن جاتے ہیں۔ انتظار حسین کے مطالعے میں ماضی کے استعمال کو عموماً یاد داشت سے منسلک کیا گیا ہے۔ یاد داشت انفرادی شخصیت کے مختلف حصوں کو مربوط کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اسی لیے ثقافتی شناخت کو قائم کرنے کا ایک وسیلہ بھی ہے۔(۱۳)

انتظار حسین کے افسانوں میں زمانوں کا گھال میل کیوں ہوتا ہے۔ دیکھیے، ہماری زندگیاں بھی کہاں یک رخی ہوتی ہیں، حوالہ تاریخی ہو، جذباتی، سماجی یا ثقافتی، کہیں بھی ہم برِ عظیم میں رہنے والے کسی ایک "روایت" میں زندگی نہیں گزار رہے ہوتے۔ پھر ہمارے نظامِ تیقنات بھی کسی ایک مابعد الطبیعات کے کامل پابند نہیں ہوتے، مختلف روایتیں اور علمیات بیک وقت ہمارے مجموعی تصورِ کائنات کا حصہ ہوتی ہیں۔ ہم عقلِ جزوی و کلی(intellects) کے ساتھ ساتھ، منطقی عقل(reasoning)، واہمہ (illusion) اور تخیل(imagination) کو اپنے ذہن میں ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

انتظار حسین کے ہاں تیقنات کے کئی متوازی دھارے بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کے افسانے کسی ایک زمانے یا تیقن کی کسی ایک لہر کو ساتھ لے کر نہیں چلتے۔ ان سے پہلے لکھنے والوں کے ہاں عام طور پر کسی ایک افسانے کے مختلف کردار زندگی کے بارے میں یا مظاہر کے بارے میں مختلف نقطہ نظر تو رکھتے ہیں لیکن سب کے ہاں کم از کم تصورِ کائنات کی سطح پر ایک یکجائی پائی جاتی ہے۔ لیکن انتظار صاحب کے

ہاں ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں ایک تہذیب کے اندر مختلف ثقافتی دھارے آ کر ملتے ہیں اور وہ شعوری طور پر ان مختلف ثقافتی دھاروں کو اپنے افسانے کا حصہ بناتے ہیں۔ وہ ہمیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ ہماری تاریخ کسی ایک تہذیبی سوتے پر مشتمل نہیں ہے۔ یہاں کئی چشمے آ کر ملے ہیں۔

انتظار حسین کے افسانوں میں یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ نو آبادیاتی دور میں ادبی اور تہذیبی معیارات کے حوالے سے جو انقطاع آیا وہ اس سے آگے جا کر ہمارا تعلق پرانی تہذیبی روایتوں سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ صوفیانہ ملفوظات ہوں، جاتک قصے ہوں یا الف لیلہ سے ماخوذ افسانے، ان سب میں انھوں نے ماقبل استعماری (precolonial) ادوار کے مختلف تہذیبی چشموں کے ساتھ اپنا تخلیقی تعلق قائم کیا ہے۔ خود برعظیم کے لوگوں کی جو کہانیاں انہوں نے بیان کی ہیں ان میں بھی وہ ایک سے زائد نظام یقین (belief systems) کو اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔ 'کٹا ہوا ڈبا' میں بھی یہ کیفیت دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں یادوں کے مختلف سنگم ملیں گے؛ پرانی اور نئی زندگی کے دھاروں میں آنے والے فرق کی بنیاد پر پروان چڑھنے والے شعور اور ان میں باہمی مکالمے کی کیفیت ملے گی؛ کردار مختلف زمانوں کے سنگم پر ذہنی جغرافیے (mental geography) کو مرتب کرنے کے لیے اپنی عمر کے مختلف ادوار کو ایک وقت میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

افسانے کا عنوان 'کٹا ہوا ڈبا' معنی کی کئی سطحیں رکھتا ہے۔(۱۴) یہ تہذیبی سطح پر اپنے ماضی سے بچھڑنے کا قصہ بھی ہو سکتا ہے، کسی کردار کے اپنی زندگی کے ایک واقعے کا عنوان بھی ہو سکتا ہے جو جذباتی طور پر اسے کسی نہ کسی سطح پر متحرک رکھتا۔ اگر غور کیا جائے تو منظور حسین کے ہاں اپنی جوانی کی ایک سہانی یاد کو دوسروں کے سامنے بیان کرنے کی کسک موجود ہے اور اسی کیفیت میں وہ بار بار اپنا قصہ بیان کرنا چاہتا ہے لیکن کوئی نہ کوئی اڑچن پیدا ہو جاتی ہے۔ سو بیتی ہوئی یہاں ان کہی رہ جاتی ہے۔ اسی لیے ڈبا، کٹا ہوا ہے۔ اس کی کیفیت ایسی ہے: وہ خواب کہ دیکھا نہ کبھی لے اڑا نیندیں

افسانے میں آوازوں (باطنی- خود کلامی؛ خارجی- گفتگو) کے اختلاط سے مختلف کہانیوں کو باہم منسلک کیا گیا ہے۔ انتظار صاحب نے چبوترے کو بطور سیٹنگ (setting) استعمال کیا ہے۔ اس فنکارانہ انتخاب (artistic selection) سے کئی باتیں ذہن میں ابھرتی ہیں۔ یہ ایک اجتماعی جگہ ہے، اور مردانہ بھی۔ یہاں سبھی کو بولنے کی آزادی تو ہے، تاہم سب کے لیے مواقع یکساں نہیں۔ افسانے کی حد تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بولنے کے لیے متکلم کی عمر، سماجی حیثیت اور مکالمے میں شریک افراد کے درمیان موجود حفظِ

مراتب جیسے عمرانی(social) ضوابط موجود ہیں۔ مکالمے میں گفتگو کے لیے اپنا حصہ بڑھانے کا انحصار باتونی ہونے پر بھی ہے، لیکن محض قالی(talkative) ہونا کافی نہیں ہے۔ دوسروں کی قبولیت(acceptance)، اور خصوصاً سامعین یا مکالمے میں شریک لوگوں کی دلچسپی بھی اپنے حصے کو بڑھانے میں معاون ہیں۔ یوں مکالمے کے اختیار(agency) پر سماجی حیثیت اور اقدار دونوں کا حصہ ہے۔ افسانے کا دوسرا اہم پہلو ذاتی یاد اور سنی سنائی بات کی یاد کا تعامل بھی ہے۔ افسانے کا بیانیہ دونوں کی مدد سے متشکل ہوتا ہے۔

افسانے میں بظاہر کوئی نسوانی کردار نہیں ہے۔ لیکن منظور حسین کی یاد ٹرین کے سفر کے دوران میں ایک سانولی سے ملاقات کی ہے، جس سے نظریں چار ہوئیں۔ سفر کے دوران میں رات کے وقت، مسافروں کا سو جانا اور حاجت کے لیے منظور حسین کا جاگنا، اور اونگھتی سانولی کی ساڑھی کا بھرے سینے سے ڈھلکنا: "اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کی انگلیوں میں رس گھلنے لگا اور ہونٹوں میں پھول کھلنے لگے۔ سانولی صورت، پسپا ہوتا ہوا بھرا بھرا گرم بدن، اندھیرے میں دمکتی ہوئی اس منور تصویر نے اس کی آنکھوں میں ایک کرن پیدا کر دی تھی جو اندھیرے میں چھپے ہوئے بہت سے گوشوں میں نفوذ کر رہی تھی، انہیں اجال رہی تھی۔" یوں پوری یاد کا نقطہ روش ہو گیا، بیان میں بھی آ گیا، لیکن یہ بیان ہم منظور حسین کی یاد آوری میں دیکھتے ہیں، یہ چوپال کی داستان طرازی کا حصہ نہیں بن پاتا۔ یہ سہانی یاد ریل کے سفر کی دین ہے۔ یوں موجود میں پرانی یاد آن ملی ہے۔ اس یاد آوری کا امکان چوپال میں سفر کے تصور پر ہونے والی بحثوں نے پیدا کیا ہے۔ افسانے کے کرداروں کی باہمی گفتگو سے پرانی سہانی یاد جاگ گئی ہے، لیکن دوسروں کی باتوں کی ریل اس قدر تیز رفتار ہے کہ منظور حسین سے پکڑی نہیں جا رہی۔ ادھر اس کے ذہن کی پٹڑی پر خوبصورت یاد کی ریل کا ایک ڈبا الگ بھاگا جا رہا ہے۔ وہ اسے باتوں کی ٹرین سے گانٹھنا چاہتا ہے لیکن دوسروں کے قصوں کا تانتا موقع نہیں دیتا۔

انتظار صاحب نے پورا اہتمام کیا ہے کہ پڑھنے والے کے حواس اس ماحول کو محسوس کر سکیں جہاں افسانے کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ پھر براہِ راست کرداروں کی عمر ایسی غیر دلچسپ تفصیلات بتانے کی بجائے ان کے حلیے کو دکھایا ہے۔ اس دکھانے سے ایک اور بات عیاں ہوتی ہے۔ کرداروں کی شخصیت محض ان سے متعلق اعداد و شمار بتا دینے سے قائم نہیں ہوتی، ان کا اپنا تصورِ کائنات ہی طے کرتا ہے کہ ان کی کن تفصیلات کو اہمیت دی جائے گی۔ مثلاً "شجاعت علی کے سفید بالوں سے ڈھکے ہونٹوں" جیسے بیان کو دیکھیے: یہاں سفید بال محض عمر کی خبر دینے کا ذریعہ نہیں ہیں، ایک باقدر(value-laden) سماج کے حفظِ مراتب سے منسلک بھی ہیں، اور ایک ایسے تہذیبی تصورِ کائنات کی خبر دیتے ہیں، جہاں تجربے کا تعلق دانش

سے ہوتا تھا۔ چبوترے میں جمی اس محفل سے کھلتا ہے کہ یہاں ابھی وہ زمانہ نہیں آیا کہ اگلے زمانے کے بے وقوفوں کا تذکرہ چھڑنے لگے۔

افسانے میں دو مختلف زمانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مکالمے، ان کے تصورِ کائنات میں پائے جانے والے فرق اور اس فرق کے نتیجے میں ہر دو کے ایک دوسرے پر اپنے اپنے زاویے سے تبصرے کی مدد سے کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ ابتدا میں فضا سازی کے لیے بصری اور سمعی وسائل بروئے کار لائے گئے ہیں۔ حقے کی گڑ گڑاہٹ، ہونٹوں میں نے، پھر کرداروں کی حرکات سے ان کے مکالمے میں شمولیت کے اطوار، جیسے مندتی آنکھیں، کھنکارنا؛ یوں افسانے میں کرداروں کا تعارف، بالواسطہ انداز میں سامنے آتا ہے اور آمدہ واقعات کے لیے ایک پس منظر بھی ابھرتا چلا جاتا ہے۔

یہ افسانہ محض نسلوں میں پائے جانے والے فصل(gap) کا بیانیہ نہیں ہے، یہ دو مختلف تصورِ کائنات کو متوازی لانے جیسے گہرے تصورات (themes) کا بیان ہے۔ یہاں پشتوں کے درمیان فاصلے (generation gap) کو کسی عام مناقشے کی طرز پر بیان کرنے کی بجائے قاری کو ایسے زمانوں میں جھانکنے کی دعوت دی گئی ہے، جو اسے اردو ثقافت کے اجتماعی ماضی سے جوڑ سکتے ہیں۔ انتظار حسین نے 'سفر' کو بطور علامت لے کر اس کی طرف دو مختلف زمانوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے مختلف ردِ عمل دکھائے ہیں۔ ایک کے لیے 'سفر وفر' میں کچھ نہیں رکھا، جبکہ دوسرے کے لیے سفر سلطنتوں کے بدل جانے کا قصہ ہے۔ اس میں برکت بھی ہے اور زحمت بھی، ایک پوری زندگی ہے۔ یہاں مہمل 'وفر' کا استعمال بامعنی ہے۔ کردار کا تصورِ سفر، اس کو عام، غیر دلچسپ مظہر سمجھنا، اس کے جملے سے ہی دکھا دیا گیا ہے۔ پھر بیانیے کی یہ خوبی بھی ملاحظہ کیجیے کہ جس کردار کے لیے سفر ایک معمولی شے ہے، اس کا جملہ بھی مختصر ہے، جبکہ دوسرے کے لیے سفر ایک زندگی جیسا ہے۔ اس لیے ایک پیراگراف سفر سے متعلق تفصیلات فراہم کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ سفر کی برکت، طوالت، اہم اور غیر معمولی واقعات کا وقوع ہونا، اور ایک پشت کے مساوی وقت کا گزر جانا جیسے اوصاف گنوائے گئے ہیں۔ اولاً سفر کو بزرگوں کی کہاوت سے منسلک کیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شجاعت علی اور مرزا صاحب اپنے ماضی سے جڑے ہوئے ہیں، جبکہ نوجوان اپنی عقل کے پتلے ہیں۔ شجاعت علی اور مرزا صاحب دونوں ہم عمر ہیں اور پرانی دنیا اور تصورِ کائنات پر یقین بھی رکھتے ہیں، اسی لیے شجاعت علی اپنی بات کی تائید کے لیے مرزا صاحب کو مخاطب کرتا ہے۔ افسانے میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ سفر سے جڑے پرانے اور نئے عوامی تصورات کے باوصف، سفر ہر کسی کے لیے کوئی نہ

کوئی ایسا واقعہ رکھتا ہے، جو زندگی بھر یاد رہ سکتا ہے۔ یوں سفر کی آسانی کے باوصف اس کی انسانی قدر کم نہیں ہوئی، بھلے برسوں، مہینوں کا سفر گھنٹوں، منٹوں تک ہی کیوں نہ سکڑ گیا ہو۔

دونوں تصورِ کائنات کا فرق دکھانے کے لیے الگ الگ طرح کے مظاہر سے کام لیا گیا ہے۔ مشینیں جدید تصور کا نشان ہیں۔ اسی لیے یہاں ریل، گھڑی، بجلی ایک ساتھ آئے ہیں۔ ان اشیا کی آمد نے زندگی کے ڈھرے کو جس طرح تیز رفتار بنایا ہے، اور زندگی کی عام تفصیلات سے گہری وابستگی جس طرح غائب ہوئی ہے، بوڑھوں کے بیانات سے اسی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔

مکالموں کے بیانیہ ارتقا میں انتظار صاحب نے خاموشی کے وقفوں (ellipses) کا فنکارانہ استعمال کیا ہے۔ آپسی بحثا بحثی کی گرمی سے شروع ہونے والے افسانے میں سکوت کے وقفے ظاہر کرتے ہیں کہ مختلف کردار کبھی اپنی کہنی کہہ گزرتے ہیں، لیکن ساتھ ساتھ وہ کسی یاد کی تصویر بھی اپنے ذہن میں دیکھتے ہیں۔ متکلم حاضر و موجود میں شامل بھی ہے، اور غائب و گذشتن کے آسیب میں گرفتار بھی ہے۔ افسانے کے آغاز میں آنے والے خاموشی کے وقفوں میں انتظار صاحب کرداروں کی بے چینی، یا باطنی کھدبد کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، بلکہ غائب راوی (third person narrator) کے ذریعے افسانے میں فضا سازی کا کام لیتے ہیں۔ بیان (narration) میں شجاعت علی کے حلیے اور افعال کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً ہم اس کے ہونٹوں میں حقے کی نے ساکت ہونے کو دیکھتے ہیں اور گڑگڑ گڑگڑ کی آوازیں چبوترے کے سکوت کا جزو بن جانے کو سنتے ہیں۔ مکالمے کے درمیان سکوتی وقفے میں کرداروں کی اپنے اندرون میں محویت، ان کے طرزِ تخاطب اور گفتگو کے مواد سے ظاہر کیا گیا ہے: مثلاً "مرزا صاحب کچھ اس انداز سے کہ بہت دور نکل گئے تھے۔۔۔" (۱۵)

انتظار حسین نے مکالمے میں باری لینے (turn taking) کے عمل (۱۶) میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے، اپنی حیثیت منوانے، نرم روی کے سبب دوسروں کے خاموش ہونے یا بات مکمل ہونے کا انتظار کرنے، اس دوران میں اپنی ذہنی دنیا میں غوطہ لگانے اور بیٹھے بیٹھے گم ہو جانے جیسی حالتوں کو افسانے کے ذریعے دکھایا ہے۔ شجاعت علی اور بندو میاں مکالموں پر چھائے ہوئے ہیں۔ بندو میاں کا بات کاٹنے، اور جلد نتیجہ نکالنے کا رویہ محفل میں بیٹھے باقی لوگوں کو خوش نہیں آتا۔ اس کا تضحیک آمیز رویہ منظور حسین جیسے نرم رو کو بھی گرم کر دیتا ہے۔ انتظار حسین نے شجاعت علی کی داستان اور منظور حسین کے اپنی جوانی کی حسین یاد کو بیان کرنے نہ کرنے کے پس و پیش کو بیانیے میں سب سے زیادہ جگہ دی ہے۔

شجاعت علی جو داستان سناتا ہے، اس میں ریل کا ایک جگہ جا کر اچانک رک جانا، اور کسی خرابی کے بغیر آگے نہ بڑھنا، پھر پٹڑی کھودنے پر تہہ خانہ بر آمد ہونا اور ایک بزرگ کا وہاں نظر آنا۔ اس ذیلی قصے کو کسی باقاعدہ نتیجے تک نہیں پہنچایا گیا۔ ایک طرف اس قصے کی تار بندھی ہوئی ہے تو دوسری طرف منظور حسین کا جوانی میں ریل کے سفر میں ایک حسین سانولی سے نظروں کا ملنا، ماضی کی اندھیروں میں ایک دور سے آتی روشنی کی مانند جھلملاتا ہے۔ انتظار حسین دکھاتے ہیں کہ سنے سنائے قصے کو تو بیان کرنے کا موقع مل گیا ہے، لیکن ہڈبیتی کو کہہ گزرنے کا موقع نہیں آیا۔ منظور حسین کے کہنے نہ کہنے کے شش و پنج کو ان کی باطنی کشمکش کہ آج جوانی کے اس قصے کو سن کر دوسرے کیا سوچیں گے اور بار بار کسی رکاوٹ کے آجانے کے سبب ان کہا چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن یہ دلچسپ ہے کہ اس کے ذہن میں ابھرنے والے واقعات کے بیان سے بڑی حد تک وہ واقعہ قارئین تک پہنچ جاتا ہے۔ دونوں قصوں میں البتہ ایک بات مشترک ہے، دونوں بیان کی حد تک بے نتیجہ رہتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ جو کچھ پیش آیا، وہ مکمل نہیں تھا، انتظار صاحب نے ان کے بیان کو کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچایا۔ جو ایک اور فنکارانہ پیچ ہے۔ حتمی نتائج کی توقع اسے ہو سکتی ہے، جو کسی واضح، طے شدہ اور مکمل تصورِ کائنات میں جی رہا ہو، جبکہ یہاں تو کچھ بھی طے نہیں ہے، ویسے بھی کٹے ہوئے ڈبے کی قسمت میں منزل کہاں ہوتی ہے۔ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔ البتہ یہ افسانہ ہمارے اعتبار کو وسعت دیتا ہے اور ہمیں پھر سے اپنی ٹرین سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایسا تہذیبی سفر ہے، ٹرین جس کا لازمی حصہ ہے، تہہ خانے میں موجود مصلیٰ نشین، تسبیح پھیرتے بزرگ اپنے مٹکے کے ساتھ زندہ ہیں، لیکن ہم سے اس مٹکے کا پانی گم ہو گیا ہے۔

افسانے کی ایک اور دلچسپ حقیقت ریل جیسی جدید شے کا کم از کم دو مختلف بلکہ متضاد حوالوں سے استعمال ہے۔ اور یہی بات انتظار حسین کے بیانیے کو پیچیدہ اور نتیجتاً زیادہ گہرا بناتی ہے۔ زندہ سماج میں کسی بھی مظہر کا محض ایک استعمال نہیں ہوتا۔ انتظار حسین نے ایک طرف ریل کو ایسے لوگوں کے تناظر میں دکھایا ہے، جن کو اس بات کا گلہ ہے کہ انگریزوں نے ریل کی پٹڑی بچھاتے ہوئے بزرگوں کی یادگاروں کا لحاظ نہ رکھا۔ دوسری طرف منظور حسین کی زندگی کی اہم ترین خوش نما یادریل کے سفر سے وابستہ ہے۔ یوں ریل بیک وقت قدیم تہذیبی اقدار کے انہدام پر تعمیر بھی ہو رہی ہے، اور اسی دوران میں بعضے لوگوں کی جذباتی زندگی کی تشکیل کا بنیادی ذریعہ بھی بن رہی ہے۔ ایسے بظاہر دور از کار، لیکن حقیقت سے قریب تر پہلوؤں کو یک جان کر دینا، بیانیے کو گہرائی عطا کرتے ہیں، جو اکہرے نظریاتی فکشن میں دکھائی دینا مشکل ہے۔

یہ افسانہ ہمیں دکھاتا ہے کہ ایک ہی سماجی منطقے (social space) کا حصہ ہونے کے باوصف انسانوں کے تصورِ کائنات میں یادداشتوں، سنی سنائی باتوں، ذاتی تجربوں اور رسمی تعلیم سے باقاعدہ سیکھی باتوں کا

حصہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مشینوں کی آمد بھی مختلف عمر کے لوگوں کے تصورِ کائنات اور تصورِ وقت میں مختلف نوع کی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ افسانہ نگار سبھی کرداروں کو ایک ہی بیانیے اور وقت کی ایک ہی رو (temporality) سے بیان نہیں کر سکتا۔ اسے بیانیے میں سکوتوں، مختلف تصورِ وقت اور علمیاتی تنوع کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے، تبھی ایک پیچیدہ سماج کے کثیر کرداروں کے تنوعات کو گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے شخصیت محض تمناؤں اور ان کی شکست پر مشتمل نہیں ہوتی، کہی، ان کہی، گزری، بیتی اور اس کی یاد کی بازیافت اور اس کو کہہ نہ پانے کی کسک بھی شخصیت کی صورت گری میں شامل ہیں۔ پھر یہ بھی اہم ہے کہ جن تیقنات کو اوہام اور غیر فطری اور بسا اوقات مافوق الفطری کہہ کر تجربی عقلیت کی بنیاد پر رد کر دیا گیا تھا، انتظار حسین بغیر کسی مدافعانہ لہجے کے، ایسے واقعات کو افسانے کا حصہ بناتے ہیں۔ یاد رہے ایسے واقعات، جیسے ایک باریش بزرگ کا بغیر کسی حسی رابطے یا تجزیاتی عقل کے، یہ اطلاع دینا کہ کیوں ٹرین آگے نہیں جا رہی، جن کے مطلع کرنے پر پٹڑی کا اکھاڑا جانا اور تہہ خانے سے مصلیٰ نشین تسبیح پھیرتے بزرگ تک جا پہنچنا، علامتی معنویت بھی رکھتا ہے کہ کیسے ایک پرانے علمی نظام پر ریل کی پٹڑی بچھائی گئی ہے، لیکن انتظار حسین نے اس پر بیانیے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا یہ کوئی مافوق الفطری واقعہ ہے۔ ان سب کو ایک کردار کی زبانی سامنے لایا گیا ہے۔ جس کے والد نے یہ قصہ سنایا تھا۔ یوں زبانی روایت وقت اور حقیقت کے متبادل تصورات کو سامنے لانے کا ذریعہ بن رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(1) Mill, James. *The History of British India.* London: Baldwin, Cradock and Joy, 1817.

(2) Chakrabarty, Dipesh. *Provincializing Europe: Postcolonial thought and historical difference.* Princeton: Princeton University Press, 2000.

(3) Mignolo, Walter. "The Geopolitics of Knowledge and the Colonial Difference." *The South Atlantic Quarterly* 101, no. 1 (Winter 2002): 57-96.

(۴) سید سجاد حیدر یلدرم . خیالستان . لاہور: شیخ مبارک علی، س ن

(۵) پریم چند . کلیاتِ پریم چند، مرتبہ مدن گوپال.، جلد ۱۱ . نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۱۔

(۶) سعادت حسن منٹو . منٹو نامہ . لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۱۹۹۵۔

(۷) راجندر سنگھ بیدی . مجموعہ راجندر سنگھ بیدی . لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۳۔

(8) Redfield, Robert. *The Primitive World and Its Transformations.* Ithaca, NY: Cornell University Press, 1953.

(9) Jones, W. T. "World Views: Their Nature and Function." *Current Anthropology* 13, no. 1 (1972): 79–109.

(10) Cohn, Bernard S. *Colonialism and Its Forms of Knowledge.* Princeton: Princeton University Press, 1996.

(11) Viswanathan, Gauri. *Masks of Conquest: Literary Study and British Rule in India.* New York: Columbia University Press, 1989.

(12) Beckert 2013

(13) Memon, 1981

(۱۴) انتظار حسین . شہر افسوس .لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۷۷.

(۱۵)ایضاً، ۷۰۔

(16) Harvey Sacks, Emanuel A. Schegloff, and Gail Jefferson. "A Simplest Systematics for the Organization of Turn-Taking for Conversation." *Language* 50, no. 4 (1974): 696–735.

REFRENCES

Beckert, Jens. 2013. "Imagined futures: fictional expectations in the economy." *Theory and Society* 42: 219–240. doi:https://doi.org/10.1007/s11186-013-9191-2.

Bedi, Rajindar Singh, Majmoo'a Rajindar Singh Bedi,(Lahore: Sang-e Meel Publications, 2003)

Chakrabarty, Dipesh. 2000. *Provincializing Europe: Postcolonial thought and historical difference.* . Princeton: Princeton University Press.

Cohn, Bernard S. 1996. *Colonialism and Its Forms of Knowledge.* Princeton: Princeton University Press.

Harvey Sacks, Emanuel A. Schegloff, and Gail Jefferson. 1974. "A Simplest Systematics for the Organization of Turn-Taking for Conversation." *Language* 50 (4): 696–735. doi:https://doi.org/10.2307/412243.

Intezar Hussain, Shehr-e Afsoos, (Lahore: Maktaba Karwan, 1977)

Jones, W. T. 1972. "World Views: Their Nature and Function." *Current Anthropology* 13 (1): 79–109.

Memon, Muhammad Umar. 1981. "Reclamation of Memory, Fall, and the Death of the Creative Self: Three Moments in the Fiction of Intizār Ḥusain." *International Journal of Middle East Studies* 13 (1): 73–91. doi:https://doi.org/10.1017/S0020743800055082.

Mignolo, Walter. Winter 2002. "The Geopolitics of Knowledge and the Colonial Difference." *The South Atlantic Quarterly* 101 (1): 57-96. Accessed December 27, 2024. doi:https://doi.org/10.1215/00382876-101-1-57.

Mill, James. 1817. *The History of British India.* London: Baldwin, Cradock and Joy.

Redfield, Robert. 1953. *The Primitive World and Its Transformations.* Ithaca, NY: Cornell University Press.

Sa'adat Hasan Manto, *Manto Nama*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 1995).

Syed Sajad Hussain Yaldaram, *Kheyalistan*, (Lahore: Sekh Mubarak Ali).

Viswanathan, Gauri. 1989. *Masks of Conquest: Literary Study and British Rule in India.* New York: Columbia University Press.

❖❖❖